JOURNAL OF ACADEMIC RESEARCH FOR HUMANITIES
ISSN 2663-192x

DOI Number of the Paper: https://zenodo.org/doi/10.5281/zenodo.10783852
Link of the Paper: https://jar.bwo.org.pk/index.php/jarh/article/view/392
Edition Link: Journal of Academic Research for Humanities JARH, 4(*1*) January-March 2024
HJRS Link: Journal of Academic Research for Humanities JARH (HEC-Recognized for 2023-2024)

فہمیدہ ریاض کے ناولوں میں مارکسی عناصر

MARXIST ELEMENTS IN FAHMIDA RIAZ'S NOVELS

Corresponding & Author 1:	**BABAR REHMAN SHAH**, Ph.D. Scholar, Department of Urdu Language and Literature, University of Sargodha Email: babarrehman56@gmail.com
Co-Author 2:	**DR. SHAHID NAWAZ**, Assistant Professor, Department of Urdu Language and Literature, University of Sargodha Email: shahid.nawaz@uos.edu.pk

Paper Information

Citation of the paper:
(JARH) Shah, B. R., and Nawaz, S., (2023). Marxist Elements in Fahmida Riaz's Navels. In *Journal of Academic Research for Humanities*, 4(1), 48–54.

QR Code for the Paper:

Subject Areas for JARH:
1 Urdu Literature
2 Humanities

Timeline of the Paper at JARH:
Received on: 01-02-2024
Reviews Completed on: 02-03-2024
Accepted on: 04-03-2024
Online on: 05-03-2024

License:
Creative Commons Attribution-Share Alike 4.0 International License

Recognized for BWO-R:
HJRS HEC Journal Recognition System

Published by BWO Researches INTL.:
BWO RESEARCHES (PVT) LTD INTERNATIONAL

DOI Image of the paper:
DOI 10.5281/zenodo.10783852

Abstract

Fahmida Riaz (1946-2018) has tried to explore diverse socialist themes in her novels. Her novels, as a whole, have not been interpreted by the intertwined Marxist tendencies present in the texts, so it was necessary to comprehend her novels from this point of view. Apparently, it can be seen that the collectivist point of view in her novels is unswervingly integrated into humanism. For the validation of this point, all of her four novels, "Godawri"(1992), "Zinda Bahar Lane"(1996), "Karachi"(1996), and "Qila-e-Faramoshi"(2017), are evaluated by applying descriptive and documentary research methodology. The Marxist elements that she has represented in her novels include the consciousness of class distinction and the negation of religious extremism, fascism, and ultra-nationalism. This article will ponder the influence of Marxism in all four of her novels.

Keywords: Marxism, Class Distinction, Religious Extremism, Fascism, Ultra-nationalism

تحقیقی سوالات:

1. فہمیدہ ریاض کے چاروں ناول کن معنوں میں مارکسی شعور کے عکاس ہیں؟
2. وہ کون سے عناصر ہیں جو فہمیدہ ریاض کے ناولوں کو مارکسی فکر سے مربوط کرتے ہیں؟

تعارف:

اردو زبان وادب میں 1930 کی دہائی میں، انجمن ترقّی پسند مصنّفین کی مساعی کی بدولت، مارکسی افکار کا عمل دخل شروع ہوا، اور کسی نہ کسی شکل میں، یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مارکسی فکر، تاریخی اور مادّی جدلیات کو اپنا مطمحِ نظر بناتی ہے۔ اس فکر میں مادّی حقیقتوں(Material Realities) کو خیال(Idea) پر مقدّم تصوّر کیا جاتا ہے۔ چناں چہ مارکسی ادب واقعیت نگاری اور صراحت کو ابہام آمیزی اور اشتباہ کے مقابلے میں ترجیح دیتا ہے۔ لہٰذا مارکسی فکر کی حامل نگارشات میں وسیع تر سماجی ابعاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، استحصال کی ہر شکل کی مذمّت ہوئے، انسانی مساوات کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے، اور ساتھ ہی مجتہدانہ روشن خیالی، وسعتِ نظر اور رواداری کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ترقّی پسند تحریک جس مارکسی زاویۂ نگاہ کو اپنا نصب العین بناتی ہے، اس کے متعلّق پروفیسر عتیق اللہ لکھتے ہیں: اپنے صحیح تر معنی میں مارکسیت ایک مادّی فلسفہ ہے جو انسانی زندگی میں معمول کا درجہ رکھنے والے تصوّرات یا عقائد کے مقابلے میں مادّی زندگی کی حالتوں کے تقدّم پر زور دیتا ہے۔ جس کے نزدیک تاریخ بہ الفاظِ مارکس، طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ جو ان مادّی حالتوں کو قابو میں رکھتی ہے جن پر زندگی کا انحصار ہے۔ انھیں حالتوں کی بنیاد پر اور ان کی جدوجہد کے جواب میں تصوّرات، فلسفے، زندگی کی ذہنی تصویریں ایک ثانوی مظہر کے طور پر نمو پاتی ہیں۔ یہی ثانوی مظہر وہ ہے جو انسانوں کو(بقول مارکس) حقیقت کی ایک صحیح تر تصویر مہیّا کرتا ہے(عتیق، 2018، ص9)۔

ترقّی پسند تحریک چوں کہ ادب کو سماجی پیداوار گردانتی ہے، لہٰذا اِس تحریک کی فعالیت کے بعد اُردو ناول کے دو تخلیقی جہات کو خصوصی اہمیت دی گئی؛ (1) وہ معاشرہ جس میں رہتے ہوئے ناول نگار نے ناول تخلیق کیا، (2) ناول نگار کا ذاتی/شخصی پس منظر، جو کہ درحقیقت تخلیقی مافی الضمیر کی تشکیل میں سب سے اہم عنصر کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر ترقّی پسند تحریک کا معیّنہ دائرۂ کار، جس میں طبقاتی کش مکش کو فن پارے کا موضوع بنانا لازم وملزوم تھا، بھی دیگر اصناف کے برعکس ناول کی صنف سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے، کیوں کہ ناول میں تخلیق کار کے پاس پلاٹ وضع کرتے وقت ترقّی پسند خیالات کی ترویج کے ضمن میں کافی امکانات میسّر ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقّی پسند تحریک کی بدولت اُردو ناول موضوعاتی سطح پر جہاں ایک کارآمد صنف ثابت ہُوا، وہیں نئے خیالات کی رزم گاہ بھی بن گیا۔ اِس حوالے سے انور پاشا لکھتے ہیں: ترقّی پسند تحریک کے آغاز کے بعد اُردو ناول زندگی اور اس

خاکہ:

فہمیدہ ریاض(1946-2018) نے اپنے ناولوں میں متنوع اشتراکی موضوعات کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کے ناولوں کی، بحیثیتِ مجموعی، متون میں پیش کئے گئے مارکسی رجحانات کی روشنی میں توضیع نہیں کی گئی، لہٰذا یہ ضروری تھا کہ ان کے ناولوں کی تفہیم اس نقطۂ نظر سے عمل میں لائی جاتی۔ واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ ان کے ناولوں کا اجتماعی نقطۂ نگاہ غیر منحرف طور پر انسان دوستی میں مدغم ہے۔ اس نکتے کی توثیق کے لیے، ان کے چاروں ناولوں، "گوداوری"(1992)، "زندہ بہار لین"(1996)، "کراچی"(1996) اور "قلعۂ فراموشی"(2017)، کو وضاحتی اور دستاویزی تحقیقی طریق کار اپناتے ہوئے جانچا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں جن مارکسی عناصر کو پیش کیا ہے ان میں طبقاتی تفریق کا شعور اور مذہبی انتہاپسندی، نسل پرستی اور فوق قومیت کی نفی شامل ہیں۔ اس مقالے میں ان کے چاروں ناولوں میں مارکسیت کے عمل دخل پر غور و خوض کیا جائے گا۔

ابتدائیہ:

فہمیدہ ریاض (1946-2018) اُردو ادب میں روشن خیالی کی روایت میں ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ فہمیدہ ریاض بنیادی طور پر شاعرہ کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہیں۔ تاہم، اُردو ناول نگاری کے ضمن میں بھی انھوں نے قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ فہمیدہ ریاض کے ناولوں میں "گوداوری"(1992)، "زندہ بہار لین"(1996)، "کراچی"(1996) اور "قلعۂ فراموشی"(2017) شامل ہیں۔ مذکورہ بالا چاروں ناول ہی فہمیدہ ریاض کے مارکسی شعور کی عکّاسی کرتے ہیں۔

فہمیدہ ریاض کے پہلے تین ناولوں، "گوداوری"، "زندہ بہار لین" اور "کراچی"، میں تینوں ممالک، بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان، میں ہونے خونریزی اور تینوں ملکوں میں پائی جانی والی بدامنی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جب کہ آخری ناول، "قلعۂ فراموشی"، میں انھوں نے چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کا پہلا اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے داعی مزدک(و:524/528) کی زندگی اور مساعی کو موضوع بنایا ہے۔ ان تمام ناولوں میں ان کا نقطۂ نظر صریحاً مارکسی فکر سے مربوط نظر آتا ہے۔ اس مقالے میں ان ہی عناصر کو نشان زد کیا گیا ہے۔

مقاصدِ تحقیق:

اس مقالے کا مقصد فہمیدہ ریاض کے تمام ناولوں کا تجزیہ کرکے یہ دیکھنا مقصود ہے کہ ان کے ناولوں کو مارکسی فکر نے کس طرح متاثر کیا ہے۔ نیز ان کے ناولوں میں سماجی وسیاسی بگاڑ کا باعث بننے والی خرابیوں اور عیوب کا کس طرح تصفیہ کیا گیا ہے، تاکہ ان کی ناول نگاری کے تخلیقی محور کو بہتر انداز سے سمجھنے میں معاونت مل سکے۔

کے مسائل کے جن نئے تقاضوں سے ہم کنار ہُوا وہ قبل کے ناولوں میں ناپید نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ نئے علوم، نظریات و تصوّرات اور عصری شعور نے ناول نگاروں کے ذہن کو وسعت، بالیدگی اور تنوّع عطا کیا۔ جس کے نتیجے میں حقیقت نگاری کے روایتی انداز میں تبدیلی آئی۔ اب ناول کا فن عصری حقائق کی عکّاسیِ محض تک محدود نہ رہا، بل کہ اِس میں ناول نگاروں کا سیاسی، سماجی، معاشی اور تاریخی شعور اور اُن کا کمٹمنٹ پوری طرح اُبھر کر سامنے آنے لگا۔ زندگی اور اِس کے مسائل کے تئیں اُن کے رویّے میں تبدیلی آئی۔ اب خواب آور رومانیت، مثالیت پسندی، جذباتیت اور اصلاحی جوش کی جگہ عقلیت پسندی، راست گوئی اور نفسیاتی و داخلی حقائق کی بے باک تصویر کشی نے لے لی (انور، 1996، ص 71-72)۔

اردو ادب میں روشن خیالی کی روایت میں فہمیدہ ریاض کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ان کی شاعری اردو زبان میں تصیف کردہ مزاحمتی و مذمّتی ادب کا ایک وقیع و قابلِ قدر سرمایہ سمجھی جاتی ہے۔ ناول کے میدان میں بھی انھوں نے اپنی روایتی وسعتِ قلب و نظر اور روشن خیالی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے، جس کا مدلّل ثبوت اس مقالے میں فراہم کیا جائے گا۔

مارکسی فکر کے تحت تصنیف کردہ ادب کو بجا طور پر نظریاتی ادب کہا جا سکتا ہے۔ 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' کے مباحث میں اوّل الذکر مکتبۂ فکر کا سب سے بڑا اعتراض ہی یہی ہے کہ ادب کو پروپیگنڈا مقاصد کے لیے استعمال کیا جانا قطعاً ناجائز ہے۔ اِس ضمن میں اقبال خورشید نے جب ایک انٹرویو میں فہمیدہ ریاض سے یہی سوال پوچھا، تو اس کے جواب میں وہ کہتی ہیں: حقیقی ادب از خود نظریہ کا پابند ہو جاتا ہے، چاہے آپ شعوری کوشش کریں، یا نہ کریں۔ بنیادی نظریہ، انصاف کا نظریہ ہے۔ وہ ہی Driving Force ہے۔ یہ بحث اب پرانی ہو چکی ہے۔ میرے خیال میں ہر طرح کا ادب نظریاتی ہوتا ہے (اقبال، 2023، ص 124-125)۔

مواد کا مطالعہ:

فہمیدہ ریاض کا ناول "گوداوری" بھارت میں ہندو مسلم فسادات کی ماہیت کو موضوعِ بحث بناتا ہے۔ یہ ناول ایک مسلمان گھرانے کے تفریحی سفر کی کہانی بیان کرتا ہے، مگر یہ سفر جلد ہی فرقہ وارانہ فسادات کے چھڑ جانے سے پھیلنے والی عمومی کشیدگی کے سبب، زندگی اور موت کا سوال نامہ بن جاتا ہے۔ اس طرح کی صورتِ حال میں معاشرے کے تمام انسان دوستانہ فلسفے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں: کیسا انسان ونسان؟ یہ ہندو مسلم فسادات تھے۔ اس میں انسان نہیں تھے۔ ہندو تھے اور مسلمان تھے۔ انسان کی انسانیت کو پکارنے کی کوشش بے سود تھی (فہمیدہ، 1995، ص 106)۔

بھارت میں گاؤ کشی کے مبیّنہ الزامات ہندو مسلم فسادات کی ایک بڑی وجہ بنتے ہیں۔ ہندو اکثر مسلمانوں پر یہ الزام دھر کر انھیں تشدّد کا نشانہ بناتے ہیں کہ مسلمانوں نے گائے کو ذبح کیا ہے، جسے کہ ہندو دھرم میں مقدّس خیال کیا جاتا ہے۔ فہمیدہ ریاض ہندو دھرم میں اس حوالے سے پائی جانے والی شدّت پسندانہ سوچ کو جہالتِ محض قرار دیتی ہیں: "گو" دراصل روشنی کو کہتے ہیں۔ گودھولی سے مراد یقیناً روشنی کا راستا ہے، نہ کہ گایوں کا راستا۔ بعد میں آنے والے، زیادہ خیال پرست مفسّرین کو شرمندگی ہوئی ہوگی کہ رگ وید کی حسین پرارتھنائیں کسی جانور کے لیے کی گئی ہوں۔ مگر دھرتی پر بستے، مٹّی اور پانی اور پیڑوں اور جانوروں سے بندھے کروڑوں ہندوؤں تک ان کی تفسیریں پہنچی بھی نہیں تھیں۔ اور انھوں نے آکاش پر اس روشن خم دار لکیر کو گایوں کا راستا ہی سمجھا تھا... بمبئی میں تو نام پوچھ پوچھ کر چاقو گھونپے جا رہے تھے (ص 104)۔

اس ناول کی مرکزی کردار 'ما'، اپنی بیٹی بڑکی کے حوالے سے فکر مند ہوتی ہے، جو کہ ایک ہندو لڑکے رمیش کے ساتھ رہ رسم استوار کر رہی ہوتی ہے، خود بڑکی بھی اچانک پھوٹ پڑنے والے فسادات کے باعث فکر مند دکھائی دیتی ہے: بڑکی کی خوش طبعی رفوچکّر ہو چکی تھی۔ اس کے چاند سے چہرے پر فکر کے بادل چھا گئے تھے۔ اچانک فسادات نے اس پر رمیش کے ہندو ہونے کا مطلب فاش کر دیا تھا (ص102)۔

ما اور اس کا خاندان جس پہاڑی ولا پر مقیم ہوتا ہے، وہاں وٹھو کربٹ اسے 'سرخ پہاڑ' کی تاریخ کے متعلّق بتاتا ہے، فسادات پھوٹنے کے بعد جب ما اور اس کے افرادِ خانہ ٹیکسی میں سوار ہو کر کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں ہوتے ہیں تو اس نظر سرخ پہاڑی پر پڑتی ہے، جسے دیکھتے ہی اسے وٹھو کربٹ کی سنائی ہوئی کہانی یاد آجاتی ہے: گوداوری مائی — گوداوری پارولیکر، دراصل گوداوری گوکھلے۔ انڈین کمیونسٹ پارٹی کی ایک کارکن تھی، جیسا کہ اس پہاڑی سے اتر کر، بمبئی میں، سنچری بازار کے پاس پارٹی آفس کے ریکارڈوں میں آپ کو پتا چل سکتا ہے۔ 1945 سے 1947 تک کے دوران، دو برسوں میں، اس کے کام نے زمیں داروں کی مار کھاتے، بیگار بھرتے، ان کے اور پولیس کے ہاتھوں آئے دن قتل ہوتے آدی واسی ورلی کسانوں کو ایک حیرت انگیز تحریک میں منظّم کر دیا تھا (ص 110-111)۔

فہمیدہ ریاض کے نزدیک برِّصغیر کے تمام مسائل کا حل ایک اشتراکی انقلاب اور اشتراکی اصولوں پر وضع کردہ معاشرتی نظام کے قیام کی صورت میں ہی ممکن ہو سکتا ہے، کیوں کہ اشتراکی نظام، اور صرف اشتراکی نظام ہی اتنی ہمہ گیری ہے کہ برِّصغیر کے لوگوں، جو صدیوں سے استحصال کا شکار ہوتے آئے ہیں، کے دکھوں کا مداوا کر سکے۔

فہمیدہ ریاض کا ناول "زندہ بہار لین" سفر نامے کی تکنیک میں لکھا گیا ہے، ناول کا دورانیہ سقوطِ ڈھاکہ کے 18 سال بعد، 1989 کا بنگلہ دیش ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار فہمیدہ ریاض خود ہی ہیں۔ دراصل وہ پاکستان کے دولخت ہونے کا ذمّہ دار چند پاکستانی جرنیلوں کو سمجھتی ہیں، جن کی استحصال پر مبنی حکمتِ عملی کے نتیجے میں پاکستان کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ اس نکتے کو وہ طنزیہ پیرائے میں یوں بیان کرتی ہیں: بنگلہ دیش میں پولیس نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ پولیس کے بارے میں ہمارے یہاں تو ایسا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا، لیکن پاکستانی فوج سے سب سے پہلے بھڑ جانے والے بھی بنگالی پولیس کے دستے تھے۔ مختلف حالات میں اس طرح کی تنظیموں تک کا کردار کس طرح بدل جاتا ہے! کسی تجزیے میں کوئی حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ پاکستان میں تو ہم تلخ مذاق کرتے تھے: بہت ہوگئی فوجی کودِتا[Coup d'etat]، اب پولیس کو موقع ملنا چاہیے۔ ہم تو بھائی، ہر قسم کے یونیفارم کو سلام کرتے ہیں (فہمیدہ، 2013، ص 71)۔

فہمیدہ ریاض بنگلہ دیش میں جا کر مشاہدہ کرتی ہیں کہ 1971 کے سانحے کے 18 سال بعد بھی، مشرقی پاکستان کے غیر بنگالی اور بہاری مسلمان کیمپوں کی خاک چھان رہے ہیں: پہلے ہم انٹرنیشنل ریڈ کراس کے تحت تھے۔ اب بنگلہ دیش ریڈ کراس کے تحت آگئے۔ ہم سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ اٹھارہ سال سے کھلا رہے ہیں۔ ان کو بین الاقوامی مدد بھی تو ملتی ہے۔ کیا کھلا رہے ہیں ہمیں؟ ہر مہینے فی آدمی تین سیر اور چار چھٹانک گیہوں ملتا ہے (ص 42)۔

فہمیدہ ریاض 1971 میں ہونے والے خون ریز واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں: مدّتوں میری فائل میں مختلف رسالوں سے کاٹی ہوئی دو تصویریں پڑی رہی تھیں۔ ان کی تاریخیں بھی الگ الگ تھیں۔ پہلی تصویر ڈھاکہ کے کسی بازار کی تھی، جہاں اچانک فائرنگ کی گئی تھی۔ سڑک پر اِدھر اُدھر لاشیں بکھری تھیں۔ ایک ہاتھ رکشا پر رکشا کا سارنگ مردہ پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر داڑھی تھی۔ گردن ایک طرف موڑ رکھی تھی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سو رہا ہے۔ صرف اس کی ٹانگیں لنگی سے اس طرح باہر نکلی ہوئی تھیں، جیسے کسی سوتے ہوئے آدمی کی نہیں ہو سکتیں۔ کالی کالی، سوکھی ہوئی ٹانگیں، اوپر کی طرف، ایک ناقابلِ بیان جنسی گستاخی سے نکلی تھیں، جیسے ہوا میں گھسیڑ دی گئی ہوں...

دوسری تصویر چند مہینوں بعد کھینچی گئی تھی۔ سفید و سیاہ تصویر سے معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ یہ جنگل ہے یا کوئی گاؤں۔ گھنے پیڑوں کے پس منظر میں کچھ بنگالی کھڑے تھے۔ تصویر کھنچوانے کے لیے سب کیمرے کی طرف منھ کیے مسکرا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کٹا ہوا سر تھا، جسے اس نے بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ ایک بہاری کا، یا کسی غیر بنگالی کا، سر تھا۔ جس لڑکے نے یہ سر پکڑ رکھا تھا، اس کے چہرے پر ایسی خوش باشی کی ہنسی تھی جیسے اس کے ہاتھ میں آدمی کا کٹا ہوا سر نہیں،

گوداوری مائی کی مثال دے کر، فہمیدہ ریاض، ما کی مثال دیتی ہیں کہ گو ما بھی گوداوری مائی کی طرح اجتہادی سوچ کی حامل ہے، مگر آج کی دنیا اس کی اجتہادی سوچ کے متعلّق اور ہی رائے رکھتی ہے: سندھی ہدایت کار مارکسی تھا۔ آدی واسیوں کی زندگی پر فلمیں بناتا تھا۔ لیکن عورتوں کے لیے اس کے خیالات اپنی ہی طرح کے تھے۔ اس کی تمام فلموں میں عورتیں کسی نہ کسی چیز کا استعارہ ہوتی تھیں۔ زیادہ تر مردوں کی غیرت کا استعارہ، جسے پامال کر کے بالائی طبقہ محنت کشوں پر ستم ڈھاتا تھا۔ یا پھر، اگر وہ کافی پُر گوشت ہوں، تو چمکتے کاسٹیوم پہنا کر وہ دنیاوی حرص و ہوس کا استعارہ بن سکتی تھیں۔ کچھ بھی ہو، وہ چپڑ چپڑ تقریریں نہیں جھاڑتی تھیں۔ ڈائریکٹر نے ما کے بارے میں سنا تھا کہ وہ انٹلکچوئل ٹائپ کی ہے۔ وہ تلخ ہنسی ہنسا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اس طرح کی عورتیں، دراصل، کسی جنسی کج روی کے رجحان جو دبا کر، اس کے نعم البدل کے طور پر انٹلکچوئل بن گئی ہیں (ص 115)۔

شدّت پسند سوچ کا تعلّق کسی مذہب سے نہیں ہے، نہ ہی شدّت پسندی کا نشانہ بننے والوں کا تعلّق لازمی طور پر کسی ایک عقیدے سے ہوتا ہے، بل کہ شدّت پسند رویّے تو ہمیشہ حرّیتِ فکر ہی کے خلاف صف آرا نظر آئیں گے: مجھے تو مسلمان بھی مار سکتے ہیں اور ہندو بھی۔ فرقہ پرست لوگ سیکولر آدمی کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں (ص 121)۔ . اس ناول میں فہمیدہ ریاض نے فرقہ واریت کی آڑ میں اپنے مفادات کی تکمیل کرنے والے طبقات کو بھی بے نقاب کیا ہے: کون کراتا ہے بھئی یہ فساد؟ جانتی ہو؟ یہ پراپرٹی ڈیولرز – کنسٹرکشن کمپنیوں والے۔ جانتی ہو کیوں؟ یہ جھونپڑیاں جو ہیں نا، انھیں خالی کرانے کے لیے، ان پر کئی منزلہ عمارتیں بنانے کے لیے۔ غریب مراٹھیوں کو پیسے دے دلا کر، ٹھرّا پلا کر، کرواتے ہیں خون خرابا۔ سرکاری افسروں کو، سیاسی لیڈروں کو، سب کو پیسہ کھلاتے ہیں۔ اور سب کھاتے ہیں پیسہ (ص 124)۔

شامل جی، جو کہ ایک کمیونسٹ اور ہندوستانی فلموں میں کیریکٹر ایکٹر تھے اور ما اور اس کے اہل خانہ نے فسادات کی دوران میں ان کے گھر پناہ لی ہوئی تھی، ما کو بھارت میں مقیم مسلمانوں کے ناگزیر ضرورت سے بھی آگاہ کرتے ہیں: ہندوستان میں مسلمانوں کو آج–ایک نئے سرسیّد کی ضرورت ہے (ص 129)۔ مذکورہ بالا بیان میں پوشیدہ جذبہ، درحقیقت فہمیدہ ریاض کی مجتہدانہ سوچ کو نشان زد کرتا ہے۔ اس ناول میں فہمیدہ ریاض کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر حمیرا اشفاق لکھتی ہیں: فہمیدہ ریاض ایک صلح پسند طبیعت کی مالک ہیں۔ اسی لیے وہ اس طرح کی قیاس آرائیاں کرتی ہیں جن سے انسانیت کو سب سے بڑا مذہب مانتے ہوئے اس کی تکریم کی جائے تاکہ مسلمان ہندو کو کمتر سمجھے اور نہ ہی ہندو مسلمانوں کو اپنے سے کمتر جان کر کے حقوق غصب کرے (حمیرا، 2007، ص 134)۔

کھیل میں مشغول رہیں: پہلے ایک پر مارپڑی اور دوسری کو حکومت دے دی گئی– برائے نام سہی، مگر مار سے محفوظ حیثیت۔ پہلی انتظار کرتی رہی کہ کب میری باری آئے پھر پہلی کی باری آئی اور دوسری پر مارپڑی، خاصی تگڑی مار۔ پہلی کو حکومت دے دی گئی– برائے نام سہی، مگر مار سے محفوظ حیثیت۔ تو آپ کے خیال میں اب دوسری کیا کررہی ہے؟...واویلا مچارہی ہے...ساتھ ہی انتظار بھی کررہی ہے۔ انتظار، کہ اب میری باری دوبارہ کب آئے گی (ص46-47)۔ س ناول میں دکھایا گیا ہے کہ ملک میں غدّاری اور وفاداری کے سرٹیفکیٹس کا اجرا کرنے کی رسم بھی سب سے پہلے اسی شہر سے چلی: جب مساجد کے اندر خونریزی شروع ہوئی تو سرکاری اداروں نے کہا– ''مسلمان ایسا نہیں کرسکتے۔ یہ ہندو ہیں، بھارتی ایجنٹ!''۔ ریاست کی داغ بیل پڑنے کے ساتھ ہی جس سرکاری پالیسی کا زور شور سے اعلان اور پرچار کیا گیا... مسلمان کے لیے مسلمان کو قتل کرنا بری بات ہے ... قتل کرنا بری بات نہیں، مسلمانوں کو قتل کرنا بری بات ہے (ص51)۔

تاہم، پنجابی، بحیثیتِ قوم، غدّاری کی اس گزند سے محفوظ رہے، جس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے، اور چھوٹے صوبوں کے پس ماندہ رہ جانے کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی صوبہ ہی ہے، کیوں کہ ملکی اسٹیبلشمنٹ پر ہر دور میں پنجابیوں ہی کی اجارہ داری قائم رہی ہے: ہر قوم جو باری باری غدّار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دیا جاچکا ہے–ماسوا پنجابیوں کے۔ اب رہے پنجابی، تو اس قوم (قومیت؟) میں انفرادی طور پر تو ہندوستانی ایجنٹوں کی کمی نہیں، شاعر فیض احمد فیض، شاعر حبیب جالب، صحافی مظہر علی خاں، سیاست داں میاں افتخار الدّین –یہ فہرست اتنی طویل تو یقیناً ہے کہ ان کی تعداد پاکستان میں بسنے والی کسی بھی قومیت کے انفرادی طور پر اعلان شدہ غدّاروں سے بڑھ کر ہوگی مگر ابھی تک پنجابیوں کو من حیث القوم غدّار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار نہیں دیا گیا ہے (ص 54-55)۔

اس ناول میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح پاکستان میں نظام کی تبدیلی کے نعرہ لگانا، ریاستی عتاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے، اس ضمن میں ایک سندھی نوجوان، اللہ ورایو، کی مثال پیش کی گئی ہے: آنے والے برسوں میں پمفلٹ بانٹنے کے معمولی سے جرم پر گرفتار ہونے والے اور ''کمیونسٹ'' کا ٹھپّا لگ جانے کے بعد گرفتار ہوجانے والے اللہ ورایو کی قسمت پر مہر لگ جائے گی، اسے کہیں نوکری نہیں مل سکے گی (ص 62)۔ ساتھ ہی، صوبۂ سندھ میں سندھی قومیت کا پرچار کرنے والے وڈیروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں مہاجر نوجواں پر تشدّد اور ہراسگی کو بھی اس ناول میں زیرِ بحث لایا گیا ہے: نعیم ہمیشہ حیدرآباد میں نہیں رہا۔ 1969 میں شہر سے دور جام شورو منتقل ہونے والی سندھ یونی ورسٹی کے شعبۂ معاشیات میں داخلے کا فارم بھرنے کی کوشش میں پتلون اتارے جانے کے بعد–جب کہ اس کے مقعد کوئی بڑی سی مچھلی ہو، جسے اس نے ابھی ابھی دریا سے پکڑا ہو۔ بہاری، یا غیر بنگالی، کا بقیہ دھڑ سامنے زمین پر پڑا تھا (ص28)۔

ان دونوں تصویروں کی خاصیت یہ ہے کہ ان عکس بندیوں میں دونوں طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم پر روشنی پڑتی ہے۔ تاہم، حالات کو اس نہج تک لے جانے میں ناقص ریاستی پالیسیوں اور حکومت کی ناعاقبت اندیشی نے بھی مہمیز کا کام کیا۔ ریاست نے الشمس اور البدر جیسی شدّت پسند مذہبی تنظیموں کو اپنی چھتر چھایا فراہم کرکے، بنگالیوں کے استحصال کے لیے استعمال کیا، آج ایک معروضی فاصلے پر رہتے ہوئے، ریاستی اداروں کی اس مجرمانہ حرکت کی سنگینی کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ان غیر بنگالی اور بہاری جوانوں پر مشتمل نوجوانوں کو تربیت ہی ایسی دی گئی تھی کہ عزّت و آبرو اور تقدیس و ناموس کی پامالی ان کی گھٹّی میں پڑ چکی تھی: بنگال سے آنے والے بہاریوں کے ہاتھوں کراچی میں چند انتہائی سفّاک واقعات واقع ہوئے۔ ایک مشہور واقعہ تھا کہ ایک بچّی کو اغوا کرکے، یرغمال بناکے، چند لڑکوں نے اذیتیں دے دے کر مار ڈالا۔ اخباروں میں کئی دن اس واقعے کا چرچا رہا تھا۔ یہ بہاری لڑکے تھے، اور بعد میں معلوم ہوا کہ بنگال میں ان کا تعلّق الشمس اور البدر کی تنظیموں سے رہا تھا (ص26-27)۔

ایسے ہی عوامل تھے جن کے باعث 1971 کے سانحے کے 18 سال بعد تک بھی بنگالیوں کے دلوں میں تمام غیر بنگالیوں اور بہاریوں کے لیے نفرت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ بنپ ہی نہیں سکا: یہ لوگ بنگالیوں کے قتلِ عام میں پاک آرمی کے مددگار بھی رہے ہیں (ص44)۔ لوگوں کو یہ بات پھر سے یاد آجائے گی، اگر انھیں مدد دی گئی تو فہمیدہ ریاض کا ناول ''کراچی'' میں ایک باشعور عورت کے مشاہدہ و تجربہ کی روشنی میں کراچی شہر کو درپیش مسائل اور ان کی حقیقت و ماہیت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ کراچی میں پھیلنے والی بدامنی کی ذمّہ دار دراصل پاکستانی اشرافیہ ہے، جنھوں نے اس شہر کو ہمیشہ لوٹنے کی خاطر للچائی ہوئی نظروں ہی سے دیکھا، کبھی اس شہر کی مزید بارونق بنانے اور آباد کرنے کا دھیان ہی ان کے دل میں آیا، نہ انھوں نے اس طرف کوئی توجّہ دی۔ نتیجتاً، روشنوں میں ڈوبے ہوئے اس شہر کو ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھا کر خونریزی اور لسانی، قومی و فرقہ وارانہ فسادات کی آماج گاہ میں بدل دیا گیا: امیر طبقے نے ہمارے خواب چرا لیے اور ان کے بدلے میں اپنے خواب ہماری آنکھوں کے پپوٹوں میں کسی زہریلے انجکشن کی طرح داخل کردیے– تموّل اور ثروت کے –عیّاشی کے خواب۔ اب ہم وہی خواب دیکھ رہے ہیں اور ہاتھوں میں بندوقیں لیے ایک دوسرے پر فائر کررہے ہیں، ایک دوسرے کی کھوپڑیاں پاش پاش کررہے ہیں (فہمیدہ، 1998، ص28)۔

دوسری جانب، وفاقی اور صوبائی سطحوں پر، سیاسی جماعتیں حکومت سازی کے عمل میں اپنی اپنی باریاں لینے، اور باریوں کا انتظار کرنے کے خود غرضانہ اور مجرمانہ

چمکنے لگی۔ اچانک مزداد کو کسان کے مردہ بچّے کے کھلے ہوئے ہونٹ یاد آئے۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ان گنت فاقہ کش کسانوں کے لاشے گرنے لگے۔ اس نے بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں لیکن وہ منظر غائب نہیں ہوا۔ اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ بستر پر گر پڑے۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموش چھت کو تکتا رہا (فہمیدہ، 2017، ص 15)۔ مزدک یہاں فیض احمد فیض کی معروف نظم "مجھ سے پہلی سی محبّت میرے محبوب نہ مانگ" کی عملی تعبیر نظر آتا ہے۔

صدیوں سے استحصال کا شکار بنتے آئے مظلوم عوام کے لیے مزدک کے اشتراکی نظریات کی بنیاد پر تعمیر کیے جانے والے معاشی نظام کا تصوّر تک ممکن نہیں تک نہیں تھا، مگر اس کے باوجود اشتراکی فکر کی للک ان کی آنکھوں کو خیرگی عطا کرتی تھی اور وہ مزدک کے افکار کو حرزِ جاں بنا چکے تھے: مزداد مزدوروں سے ملا۔ کان کن، چرواہے، لکڑہارے، معمار۔ وہ اس کے پیروں پر گر پڑے اور انھوں نے آنسو بہائے۔ لیکن چوری یا ڈاکے کے علاوہ انھیں کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آتا تھا۔ وہ چوریاں کر رہے تھے اور ڈاکے ڈال رہے تھے۔ وہ پکڑے جا رہے تھے اور اذیت دے دے کر مار ڈالے جانا ان کا مقسوم تھا۔ جو کچھ مزداد کہتا تھا وہ کبھی ہوا نہیں تھا۔ اس کا وہ تصوّر تک نہیں کر سکتے تھے۔ ہر چیز کی مشترک ملکیت؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا! (ص23)۔

مزدک کی مساعی اس قدر کامیاب تھی کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو پیغمبر اور اپنی فکر کو برحق سمجھنے لگا تھا: اے خدائے پاک! اے اہورامزدا! خدائے بزرگ و برتر، اے پاک پروردگارِ کائنات۔ مجھے ہمّت دے، اے اہورامزدا— مجھے طاقت دے کہ میں ثابت قدمی سے وہ کچھ کہہ سکوں جو میرے دل و دماغ میں بالکل صاف صاف آ رہا ہے۔ کیا یہ تیرے ہی بھیجے ہوئے خیالات نہیں؟ ہاں یہ تیرا ہی نور ہے۔ یہ تیرا ہی پیغام ہے۔ یہ تیری ہی امانت ہے (ص 51)۔

مزدک کی مساعی کو قباد کی پشت پناہی حاصل تھی، کیوں کہ قباد کو اقتدار کے ایوانوں تک پہنچانے میں مزدک کی ہر دلعزیزی نے کلیدی کردار ادا کِیا تھا۔ تاہم، قباد کی وفات کے بعد، جب اقتدار کی باگ ڈور قباد کے بیٹے، خسرو نوشیروان، جس کے دل میں مزدک کے لیے شروع ہی سے کد تھی، کے ہاتھوں میں آئی، تو اس نے نہ صرف مزدک کا نام و نشان مٹانے کا مصمّم ارادہ کِیا، بل کہ اس ارادے کو عملی جامہ بھی پہنایا، مزدک کو قتل کر کے وہ وزرگان کو مخاطب کر کے کہتا ہے: آپ کا کام اب شروع ہوا ہے۔ کل سے مزدک کا نام صفحۂ سلطنت سے مٹانا شروع کیجیے۔ اس کا اور اس کے مذموم خیالات کا کہیں ذکر نہ ہو۔ اس کا نام بھی کسی کی زبان پر نہ آنے پائے۔ ہمیں اس کو نہیں، اس کی یاد کو قلعۂ فراموشی کے سپرد کرنا ہے۔ ہوشیار اور خبردار! اگر اس کا ذکر کرنا ہی پڑے تو صرف برائی کے ساتھ کِیا جائے۔ آنے والی نسلیں بھی اس کے اور اس کے خیالات کے بارے میں چنداں معلومات حاصل نہ کر

میں دو تین گلابی عضو ہائے تناسل طاقت ور دھکّوں کے ساتھ گھسنے کی کوشش کر رہے تھے اور سر پر "جیے سندھ" کے نعرے گونج رہے تھے—روتے ہوئے اور سر پٹکتے ہوئے اس نے کراچی چلے جانے کا فیصلہ کر لِیا تھا اور حیدرآباد کے ان گنت خاندانوں کی طرح اس کا خاندان بھی کراچی آ کر بس گیا تھا (ص 68)۔ اور اس تمام اتیاچار کو ہوا دینے میں ریاست کے طاقت ور خفیہ اداروں نے بھی بھرپور کردار ادا کِیا ہے: شواہد موجود ہیں کہ کراچی میں شہریوں کو ذمّے دار اداروں کی جانب سے دہشت گردوں سے خود نمٹنے کے لیے ہتھیاروں کی پیش کش کی گئی ہے، یہ سوچے بغیر کہ ان کا دیا ہوا ہر ہتھیار ایک نیا قاتل پیدا کرے گا (ص 72)۔ کراچی کی تشویش ناک صورتِ حال کے پیشِ نظر، ادیبوں اور شاعروں کا اس شہر کی صورتِ حال کو موضوع بنانے سے پہلو تہی اختیار کرنا بھی کم باعثِ تشویش نہیں ہے۔ کم ہی لوگ اس پلِ صراط سے گزرنے کی ہمّت اور حوصلہ مجتمع کر پاتے ہیں۔ ناول میں عورت کو اس کا بظاہر مارکسی دوست مشورہ دیتا ہے کہ وہ بھی اس موضوع کے متعلّق سوچنا ترک کر دے: کراچی کے لیے روتی کیوں ہیں بزدلوں کی طرح؟ اس کے بدلے—ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں؟ کیا وہ بالکل برباد نہیں ہو جائیں گے؟... عورت سوچ میں پڑ گئی— آیا اسے بزدلوں کی طرح کراچی پر رونے کے بدلے (بہادروں کی طرح) ہندوستان کے مسلمانوں پر رونا چاہیے؟... یقیناً یہ زیادہ محفوظ بات تو ہے... ملکی متحارب لوگوں کے رتاب سے اسی طرح بچا جا سکتا ہے—اسٹیبلشمنٹ کی بھی یہی رضا ہے کہ لکھنے لکھانے والے کراچی کی گندی بحث میں الجھنے کے بجائے ملک اور مسلمانوں کے خلاف بیرونِ ملک کی جانے والی نت نئی سازشوں پر خامہ فرسائی کریں (ص 106)۔

فہمیدہ ریاض کا ناول "قلعۂ فراموشی" چھٹی صدی عیسوی کے ایک زرتشتی راہب مزدک کی انقلابی مساعی اور عبرت ناک و المیاتی انجام کو موضوع بناتا ہے۔ مزدک کے متعلّق سیّد سبطِ حسن لکھتے ہیں: مزدک ایک ایسے سماجی انقلاب کی دعوت دے رہا تھا جس سے ساسانی سوسائٹی کے صدیوں پرانے طبقاتی رشتے درہم برہم ہو جانے کا احتمال تھا۔ نہ امیروں اور نہ زرتشتی موبدوں کی جاگیریں باقی رہتیں، نہ ان کی حرم سراؤں اور غلام گردشوں کی رونق رہتی۔ نہ کوئی آقا ہوتا اور نہ کوئی غلام۔ مزدک کی تحریک رفتہ رفتہ عوام میں اتنی مقبول ہوئی کہ اکثریت نے اسے تسلیم کر لِیا (سبطِ حسن، 1977، ص124-125)۔

اس ناول میں مزدک ایک ایسے انقلابی شخص کی صورت میں سامنے آتا ہے، جس کا دل ہمہ وقت بھوک اور افلاس کے شکار عوام کے لیے دھڑکتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی پسندیدہ عورت، یاقوت دخت (مزدک کی بیوی) کی رفاقت بھی اس کے خیالات کے سلسلے کو توڑ نہیں سکتی تھی: "میں خوش ہوں— آج ہم یونانی طریقے سے پیار کریں گے" یاقوت دخت مسکرائی اس کے دانتوں کی لڑی گلابی ہونٹوں میں

سکیں۔ آج شب کی اس ساعت سے، مزدک انسانوں کی یادداشت سے رخصت ہوا(ص 160)۔

مزدک کے قتل کے دوسرے ہی دن سے خسرو نوشیروان کے حکم کی تعمیل شروع ہو جاتی ہے: دوسرے دن شہر میں سنّاٹا تھا۔ مزدک اور اس کے تمام پیشوا غائب تھے۔ اس کے مریدوں کا مجمع گھروں میں روپوش تھا (ص 161)۔ ”قلعۂ فراموشی“ میں فہمیدہ ریاض نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح مقتدر اشرافیہ انقلابی مساعی کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے، اور مطلوبہ مقاصد کی تکمیل کے بعد، ان انقلابی عناصر کا بھی قلع قمع کر دیتی ہے، کیوں کہ اس بات کا قوی امکان موجود رہتا ہے کہ یہی انقلابی ان کے اقتدار میں آنے کے بعد اپنائے جانے والی استحصالی ہتھکنڈوں کے خلاف مزاحمت کا راستہ اختیار کر کے ان کی تلواریں کند کریں گے، لہٰذا ان کو نیست و نابود کرنے میں ہی عافیت ہے۔

فہمیدہ ریاض کی نگارشات میں مجتہدانہ مارکسی سوچ کہیں کہیں صوفیانہ لب و لہجہ اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسے مقامات پر ان کے یہاں انقلابی لے کی ترنگ میں سے تیاگ کا پیغام نشر ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جب اقبال خورشید نے فہمیدہ ریاض سے اس بابت سوال کیا، تو ان کا جواب دلچسپی سے خالی نہیں تھا، وہ کہتی ہیں: صوفی دنیا کی Interpretation (تفسیر) کرتا ہے، مارکسسٹ اسے تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ ایک کڑی ہے، جو انھیں جوڑتی ہے۔ جیسے صوفی شاہ عنایت کی مثال ہے، جنھوں نے 'زمین اللہ کی' کہہ کر اپنی املاک ہاریوں میں بانٹ دیں۔ مڈل ایسٹ میں ایسے صوفیوں کی مثالیں ہیں، جنھوں نے سماجی انصاف کے لیے جدوجہد کی ہے۔ تو صوفی اور انقلابی میں اتنا فرق نہیں، جتنا سمجھا جاتا ہے۔ مارکسزم کی بنیاد فقط یہ نہیں ہے کہ کسی کو آپ انتہائی غریب نہ ہونے دیں، یہ بھی ہے کہ کسی کو آپ انتہائی امیر نہ ہونے دیں، کیوں کہ اس کی کوئی حد نہیں۔ صوفی ازم میں جو نفسِ امارہ کو قابو کرنے کا تصور ہے، یہ وہی ہے۔ سوشل ازم نجی ملکیت کے خلاف ہے۔ صوفی ازم اس کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، آپ کو سب چھوڑ چھاڑ کر جانا پڑے گا (اقبال، 2023، ص 129-130)۔

صوفی جہاں مادی آسائشوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے جوگ لینے اور بیراگی بننے پر ترجیح دیتا ہے، وہیں ایک سچا مارکسی مادی آسائشوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے انقلابی جدوجہد کا راستہ اختیار کرتا ہے، دونوں کے یہاں مادیت پرستی کی نفی ہی وہ پہلا زینہ ہے جس پر قدم رکھ کر دونوں اپنی اپنی منزلوں کی جانب گامزن ہو جاتے ہیں۔ تاہم، چوں کہ دونوں ہی کے آدرش ایک ہی سوتے سے پھوٹے ہیں، لہٰذا دونوں کے افکار میں حیرت آگیں مماثلت پائی جاتی ہے۔ فہمیدہ ریاض کی نگارشات میں بھی اس مماثلت کے ناقابلِ تردید شواہد جابجا دکھائی دیتے ہیں۔

مقالے کا نیا پہلو:

اس مقالے میں پہلی مرتبہ فہمیدہ ریاض کے تمام ناولوں کا تجزیہ پیش کر کے، نہ صرف ان کے ناولوں میں موجود مارکسی عناصر کو نشان زد کیا گیا ہے، بل کہ ساتھ ہی ان ناولوں کی روشنی میں فہمیدہ ریاض کے تخلیقی محور کی روشن خیالی کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، جو کہ ان کے ناولوں کے موضوعاتی ابعاد کو حقیقی معنوں میں قابلِ تفہیم بنانے کے سلسلے میں ناگزیر ہے۔

حاصلِ بحث:

فہمیدہ ریاض نے اپنے ناولوں میں برِ صغیر کے تین بڑے ممالک، بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان، کے سیاسی و سماجی نظام میں پائی جانے والی خرابیوں اور عیوب کو نشان زد کیا ہے۔ ان ناولوں میں طبقاتی تفریق، مذہبی فرقہ واریت، لسانی و قومی شدّت پسندی اور ریاستی جبر کی شدید مذمّت کرتے ہوئے، ان عناصر کو سیاسی و سماجی بگاڑ کی اصل وجہ بتایا گیا ہے، ساتھ ہی تصفیے کے طور پر متبادل مارکسی نظام کی قیام کی راہ سجھائی گئی ہے، ایک ایسا نظام جس میں اس نوعیت کے سماجی بگاڑ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے نزدیک مذکورہ بالا عیوب اور خرابیوں کے سدِباب کیے بغیر سیاسی و سماجی نظام کی مثبت سمت بندی ناممکن ہے۔

سفارش:

مذکورہ بالا مقالے کی روشنی میں سفارش کی جاتی ہے کہ مستقبل کے محققین فہمیدہ ریاض کی دیگر اصناف پر مبنی نگارشات کی کماحقہ تفہیم و توضیح کے ضمن میں ان کے مرکزی فکری دھارے، مارکسیت کو بنیاد بنائیں، کیوں کہ مارکسی نقطۂ نظر ہی فہمیدہ ریاض کی تصانیف کی تخلیقی اساس ہے۔

References

Iqbal Khursheed, (2023), Fiction se Mukalma, Lahore: Sangemeel Publications,
Anwar Pasha, (1996), Taraqqi Pasand Urdu Novel ,New Dehli: Peshrau Publications
Humaira Ashfaq, Dr., (April-June 2007), "Fahmida Riaz Novel Nigar", in Adab Saaz, Issue 3
Sibt-i Hasan, Syed , (1977), Moosa se Marx tak, Karachi: Maktaba-e- Danyal
Ateeq Ullah, Professor, (2018), Tanqeed ki Jamaliyaat, Lahore: Fiction House, Vol. 4
Fahmida Riaz, (2017), Qila-e-Faramoshi, Karachi: Oxford University Press
Fahmida Riaz, (1998), Karachi, Lahore: Takhleeqat
Fahmida Riaz, (1995), Godawri, Islamabad: Dost Publications
Fahmida Riaz, (2013), Hum Log, Karachi: Oxford University Press